رسائل و مسائل

اسلام کے مآخذِ قانون اور تعبیر و اجتہاد

سوال:

ڈاکٹر محمصانی، بیروت کے پروفیسر برائے قانون، جو حکومت پاکستان کی دعوت پر اس ملک میں تشریف لائے، انھوں نے اسلامی قانون پر کراچی میں ایک تقریر کی۔ عرب ممالک میں قانونی ارتقا کے تین ادوار، خلافتِ دورِ عثمانی اور جدید زمانے کا تذکرہ کر کے انھوں نے اس پر بحث کی کہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق اسلامی قانون میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں۔ ان کی بحث کا ماحصل یہ تھا کہ اسلامی قانون کے دو حصے ہیں: ایک خالص مذہبی، دوسرے معاشرتی۔ جہاں تک مذہبی قانون کا تعلق ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ کبھی نہ بدلنے والے حقائق پر مشتمل ہے، مثلاً توحید، عبادات وغیرہ۔ معاشرتی قانون دو مآخذ پر مبنی ہے: ایک اجتہاد، اور دوسرے قرآن و حدیث۔ اجتہاد ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور بدلنا چاہیے۔ احادیث میں سب سے پہلے سوال صحیح و غیر صحیح کا ہے، پھر صحیح احادیث بھی دو قسم کی ہیں: لازمی (OBLIGATERY) اور اختیاری یا سفارشی (PERMISSIVE)۔ پس آخر کار بحث ان احکام کی رہ جاتی ہے جو یا تو قرآن پر یا صحیح لازمی احادیث پر مبنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان دونوں چیزوں کے ——— الفاظ کو نہیں (کیونکہ وہ علی حالہٖ موجود ہیں اور تبدیل نہیں کیے جا سکتے) ——— سوسائٹی کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئی تعبیر (INTERPRETATION) دی جا سکتی ہے؟ ڈاکٹر محمصانی نے کہا کہ اس بارے میں فقہا کے دو گروہ ہیں: (۱) اکثریت کی رائے یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیح کو نئے معنی نہیں پہنائے جا سکتے (۲) اقلیت کا استدلال یہ ہے کہ قانون ایک معاشرتی عمرانی سائنس ہے، لہٰذا جیسے جیسے معاشرت و عمران میں تبدیلی ہوتی جائے قانون کو بھی بدلنا چاہیے، ورنہ وہ زمانے سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھے گا۔ اسلام ترقی، تہذیب اور بہبودِ عامہ کا دین ہے

اور اس کی یہ خصوصیات باقی نہیں رہتیں یا اگر ہم اس بارے میں قدامت کا رویہ اختیار کریں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیں اور بتایا کہ نہایت کثرت سے انھوں نے ایسی نظیریں اپنی کتاب (PHILOSOPHY OF ISLAMIC JURISPRUDANCE) میں دی ہیں۔

پہلی مثال یہ تھی کہ ایک حدیث صحیح میں گیہوں اور جو اور رقیق اشیا کے پیمانے سے ماپنے کا تذکرہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی رواج تھا، بعد کو جب وزن کے حساب سے یہ چیزیں فروخت ہونے لگیں تو ایک شخص نے امام ابو یوسف سے استفسار کیا، انھوں نے کہا کہ وہ معاہدہ جو وزن کے پیمانے سے ہوا ہو جائز ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ رواج کے بدل جانے سے احادیث کی تعبیر یا اطلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال جس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے استدلال کیا کہ نہ صرف حدیث بلکہ قرآن کے الفاظ کو سوسائٹی کی ضروریات بدل جانے پر نئی تعبیر دی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ قرآن میں صدقات کے مصارف میں مؤلفۃ القلوب کا بھی ایک حصہ رکھا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب نومسلموں کو صدقات میں سے کچھ دینے سے انکار کر دیا تو انھوں نے قرآن کی آیت سند میں پیش کی کہ یہ تو ہمارا حق ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے، آپ اسے کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت اسلام کمزور تھا، اس لئے اس کی ضرورت تھی، اب اسلام خدا کے فضل سے قوی ہے، لہٰذا اب ضرورت باقی نہیں رہی، پس میں تم کو یہ حصہ نہیں دوں گا۔

اس قسم کی مثالوں میں ایک معاملہ قطع ید کا بھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو جس نے بیت المال میں چوری کی تھی، اور دوسرے کو جس نے اپنے آقا کا مال چرایا تھا، قطع ید کی سزا نہیں دی، اس دلیل سے کہ اُن کا اس مال میں حصہ تھا۔ اسی طرح قحط کے زمانے میں آپ نے اس سزا کو موقوف کر دیا۔

ڈاکٹر صہسانی نے دورانِ تقریر میں قانون کے چار ماخذ بتائے: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔

میرے ذہن میں ان کی تقریر کے بعد مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) متذکرہ بالا چار ماخذ کے علاوہ اور کونسی چیزیں ماخذِ قانون ہیں؟ کیا علت، دوسرے ممالک کے رواج، عرف، عادت، تعامل، سنن ابطل، عموم البلوی، صاحب امر کی ہدایات، معاہدات وغیرہ کو ماخذِ قانون

بنایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ فقہاء نے ان تمام کو مآخذِ قانون کی فہرست میں تو نہیں لکھا لیکن دورانِ بحث میں ان تمام کا تذکرہ مآخذِ قانون کی حیثیت سے کیا ہے، اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، مثلاً حضرت عمرؓ نے زراعت و مالیاتی قانون میں شامی، مصری اور ایرانی قانون کی پیروی کی، رجسٹر اور حساباًت رکھنے کے طریقے ان سے اخذ کئے، غیر اسلامی حکومت کے تاجروں پر اتنا محصول عائد کیا جتنا کہ ان کی حکومتیں مسلمان تاجروں پر عائد کرتی تھیں ——— تو کیا اس سے یہ اصول مستنبط نہیں ہوتا کہ قرآن وحدیث کی مقرر کردہ حدود کے اندر دوسرے ممالک کے قانون سے استفادہ، اور نہ صرف استفادہ بلکہ اس کو بعینہٖ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عثمانؓ کا عمل تو کم از کم یہی ثابت کرتا ہے۔ آج اگر اسلامی حکومت وجود میں آئے تو کیا وہ مغربی ممالک کی سیاسی، معاشرتی، ادبی، اقتصادی اور سائنٹفک ترقیات کو نظر انداز کر کے نئے سرے سے اپنی عمارت کی بنیاد رکھے گی، محض اس غلط تصور اور تعصب کی بنا پر کہ جو کچھ مغرب سے آیا ہے وہ غلط ہے؟ کیا یہ تصور بالکل اسی طرح غلط نہیں کہ جو کچھ مغرب سے آیا وہی صحیح ہے؟ اگر یہ ایک انتہا ہے تو وہ دوسری انتہا ہے۔ پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مغرب کی جو باتیں شریعت کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں ان کو بعینہٖ، یا ان میں ادل بدل کر کے، لے لیا جائے؟

(۲) بزرگانِ سلف اور ائمہ نے جو اجتہادات کئے، اگر ان مسائل میں کوئی تبدیلی و اضافہ ممکن نہیں تو ان کو اختیار کر لیا جائے، ورنہ زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کے مطابق ان کا اجتہاد کچھ مسائل میں اگر سازگار نہ رہا ہو تو آج کے فقہاء از سرِ نو اجتہاد کریں جو دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق ہو۔

(۳) کیا قرآن وحدیث کے الفاظ کو تبدیل کئے بغیر سوسائٹی اور معاشرت کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ان دو مآخذ کے الفاظ کی تعبیر میں تبدیلی، اضافہ یا کمی کی جا سکتی ہے؟ مثلاً جیسا کہ مؤلفۃ القلوب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے مسائل آج بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ان احکام و مسائل میں جو نصوصِ قرآنیہ یا احادیثِ لازمی پر مبنی ہیں، زمانے کی ضروریات اور ان احکام کی علت بدل جانے پر ایسے نئے احکام مستنبط کئے جا سکتے ہیں جو اسلام کی روح کے مطابق ہوں۔ آخر فقہاء ہی کا یہ متفق علیہ مسلک ہے کہ ہر حکم کی ایک علت ہے اور فلاحِ عامہ بہرحال مقدم ہے۔

مثلاً زکوٰۃ کا حکم قرآن شریف میں مذکور ہے لیکن زکوٰۃ کی کوئی شرح مذکور نہیں۔ احادیث میں جو شرح مذکور ہے وہ اس زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اب ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زکوٰۃ کو ملک کے عام ریونیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل ہے (جبکہ حکومت اسلامی ہو) ؟ اگر ہے تو دوسرا سوال شرح کا ہے کہ آج کے مالیاتی تقاضے قدیم شرح سے پورے نہیں ہو سکتے۔

ان سوالات سے ہٹ کر ایک دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن آیا ایک کوڈ ہے یا نہیں ؟ بظاہر قانونی اعتبار سے قرآن ایک ترمیمی ضابطہ (AMENDING CODE) کی حیثیت رکھتا ہے جس نے بہت سے اُن رواجوں اور دستوروں کو قائم رکھا جو عرب میں جاری تھے، سب میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن ایک مکمل کوڈ ہے، کس حد تک درست یا غلط ہے ؟

جواب :

آپ نے جن مسائل کے متعلق اظہارِ رائے کی فرمائش کی ہے میں اُن پر "حقوق الزوجین"، "سود" اور "اسلامی قانون" میں ایک حد تک مفصل بحث کر چکا ہوں۔ آپ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں کہ کون سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات عرض کئے دیتا ہوں۔

(۱) علت، عرف، عادت، تعامل، سنن القبل، عمومِ بلویٰ، صاحبِ امر کی ہدایات، معاہدات اور ممالکِ غیر کے رواجات بجائے خود ماخذِ قانون نہیں بن سکتے، بلکہ یہ سب اجماع اور قیاس کے ضمن ہی میں داخل ہوں گے۔ اور خود اجماع و قیاس بھی اصل ماخذِ قانون نہیں ہیں بلکہ قرآن و سنت کے تابع ہیں۔ اجماع ہو یا قیاس، دونوں صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتے ہیں جبکہ استدلال کی بنا قرآن و سنت کے امر و نہی یا اباحت پر رکھی گئی ہو۔ امر و نہی کے معاملے میں قیاس و اجتہاد کو لامحالہ نصوص کا پابند ہونا پڑے گا، اور جس قیاس و اجتہاد پر اجماع ہو جائے، یا جمہور متفق ہو جائیں وہی ملک کا قانون بن جائے گا۔ رہے مباحات تو ان کے دائرے میں ہم بیرونی ممالک کے طریقوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں، اپنے ملک کے عرف و رواج کو بھی برقرار رکھ سکتے ہیں، عمومِ بلویٰ کا لحاظ بھی کر سکتے ہیں اور دوسرے ماخذ کی طرف بھی رجوع کر سکتے ہیں، بشرطیکہ جو قوانین بھی ہم

بنائیں وہ بہ حیثیت مجموعی اسلامی زندگی سے مطابقت رکھتے ہوں۔

(۲) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو آئین قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں، اور نہ سب کے سب دریا برد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے، مگر صرف بقدرِ ضرورت اور اس شرط کے ساتھ کہ جو رد و بدل بھی کیا جائے دلائلِ شرعیہ کی بنا پر کیا جائے۔ نیز نئی ضروریات کے لئے نیا اجتہاد بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے بھی شرط یہی ہے کہ اس اجتہاد کا ماخذ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ہو اور یہ اجتہاد وہ لوگ کریں جو علم و بصیرت کے ساتھ جذبۂ اتباع و اطاعت بھی رکھتے ہوں۔ رہے وہ لوگ جو زمانۂ جدید کے رجحانات سے مغلوب ہو کر دین میں تحریف کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے حقِ اجتہاد کو تسلیم کر لینے سے ہمیں قطعی انکار ہے۔

(۳) اصولی طور پر تو یہ بات صحیح ہے کہ احکامِ شرعیہ کے اجرا و نفاذ میں حالات کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ نصوص کے الفاظ کی تعبیر میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے، لیکن بحث اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اجمال کو چھوڑ کر ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔ یہاں متعدد تفصیلات ہمارے سامنے ایسی آتی ہیں جن میں تغیر پسند اصحاب کی تجاویز ہم کو حدِ جواز سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہی زکوٰۃ کا معاملہ ہے جسے آپ نے مثال میں پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک زکوٰۃ کو ملک کے عام ریونیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مالی عبادت ہے، اور اس کے لئے شارع نے جو نصاب، شرح اور مصارف مقرر کئے ہیں ان میں رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن چیزوں پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے ان میں بھی کمی بیشی ممکن نہیں ہے، الّا یہ کہ کسی چیز کو شارع کی مقرر کردہ اشیاء پر قیاس کر لیا جائے۔ رہیں حکومت کی ضروریات تو ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ایک اسلامی حکومت جمہور کی خدمت کے جن جن کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے ان کی انجام دہی کے لئے وہ جمہور پر ٹیکس لگا کر اپنے مصارف پورے کر سکتی ہے، بشرطیکہ ٹیکس انصاف کے ساتھ لگائے جائیں اور ایمانداری کے ساتھ ان کو خرچ کیا جائے۔

(۴) آپ کا آخری سوال کہ قرآن ایک "کوڈ" ہے یا نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کوڈ نہیں بلکہ کتابِ ہدایت ہے جس میں سوسائٹی کی اصلاح و تنظیم کے لئے قانونی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ محض اس لئے کہ اس میں

قانونی ہدایات بھی ہیں، اس کو "کوڈ" کہہ دینا درست نہیں ہے۔ اور "مکمل کوڈ" کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا اور بھی زیادہ غلط ہے۔ جو بات صحیح طور پر کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن ایک مکمل کتابِ ہدایت ہے۔ (ا۔م)

برطانیہ میں ایک مسلمان طالبعلم کے لئے مشکلات

سوال:

یہاں آکر میں کچھ عجیب سی مشکلات میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سب سے زیادہ پریشانی کھانے کے معاملے میں پیش آرہی ہے۔ اب تک گوشت سے پرہیز کیا ہے، صرف سبزیوں پر گزارہ کر رہا ہوں۔ سبزی بھی یہاں آپ جانتے ہیں صرف ابلی ہوئی ملتی ہے اور وہ بھی زیادہ تر آلو۔ انڈا یوں بھی کمیاب ہے اور پھر اس پر راشن بندی ہے۔ ہفتے میں دو تین انڈے مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب امام ووکنگ مسجد (لندن) سے ملا۔ انھوں نے یہ بتایا کہ کلام پاک کی رو سے ایک تو سؤر کا گوشت حرام ہے، دوسرے خون، تیسرے مردار اور چوتھے وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جائے۔ پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک یہاں کے طریقۂ ذبح کا تعلق ہے اس سے شہ رگ کٹ جاتی ہے اور سارا خون نکل جاتا ہے، چونکہ اس خون کا نکلنا طبی نقطۂ نظر سے ضروری ہے، لہٰذا اس کا یہاں خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ گردن پوری طرح الگ کر دی جاتی ہے، لیکن کلام پاک میں اس سلسلے میں کوئی ممانعت وارد نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں جانور کسی کے نام پر ذبح نہیں کئے جاتے، بلکہ وہ تجارتی مال کی حیثیت سے سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اللہ کا نام تو نہیں لیا جاتا لیکن کسی اور کا بھی نام نہیں لیا جاتا، پس وہ غیر اللہ سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے بہت کچھ بحث رہی مگر میری طبیعت نہیں مانتی کہ یہ گوشت جائز ہو سکتا ہے۔

پھر کھانے میں جو سوپ دیا جاتا ہے وہ کبھی کبھی تو صرف سبزیوں سے بنا ہوا ہوتا ہے، مگر آج ہی اتفاق سے اس میں ایک ٹکڑا گوشت کا نکل آیا۔ شکایت کی تو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی گوشت اور سبزی ملا کر بھی سوپ

بنایا جاتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ جہاں سو دو سو آدمی اطمینان سے یہ سب کچھ کھا پی رہے ہوں وہاں دو چار آدمیوں کا لحاظ کون کرے گا؟ پھر مکھن، پنیر اور میٹھا کھانا بھی دسترخوانوں پر آتا ہے۔ ان چیزوں میں بھی حرام دودھ یا چربی کی آمیزش ہونے کے بارے میں قوی شبہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں باورچی حرام کھانوں میں استعمال ہونیوالے چمچے اٹھا کر دوسرے کھانوں میں ڈالتے رہتے ہوں گے۔ یہ کچھ عجیب پیچیدگی ہے جسے حل کرنے میں مشورہ مطلوب ہے۔

دوسری بات نمازوں کے متعلق دریافت طلب ہے۔ صبح کی نماز کا وقت ۶ بج کر ۴۸ منٹ تک رہتا ہے یہ تو اللہ کے فضل و کرم سے ادا کر لیتا ہوں۔ ظہر کے لئے مشکل سے وقت ملتا ہے۔ ۱۲½ سے لے کر ۱½ تک کھانے کے لئے وقت ملتا ہے۔ اسی ایک گھنٹہ میں کلاس سے MESS تک آنے جانے میں بھی وقت لگتا ہے اور اس میں سے وضو اور نماز کے لئے بھی وقت نکالتا ہوں، لیکن بہت ہی دقت ہوتی ہے۔ عصر کے لئے سرے سے وقت ملتا ہی نہیں، کیونکہ فرصت ۴½ بجے ہوتی ہے اور ۴½ بجے سے ۵ بجے تک ناشتہ ہوتا ہے اور ۴ بج کر ۴۸ منٹ پر مغرب ہو جاتی ہے۔ ناشتہ کے فوراً بعد مغرب تو ادا کر لیتا ہوں، لیکن عصر رہ جاتی ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کا قاعدہ کیا ہے۔ ووکنگ مسجد کے امام صاحب بعض اوقات نمازوں کو ملا کر پڑھتے ہیں۔

یہاں ہم بارہ طلبا آئے ہوئے ہیں جن میں سے مجھ سمیت کل پانچ لڑکے ایسے ہیں جو دین کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اور بقیہ ایسے ہیں کہ ہم کو طرح طرح سے بیوقوف بناتے ہیں۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ میں ان باتوں سے کبھی نہیں گھبراتا بلکہ صحیح بات معلوم کر کے اس پر عمل بھی کرنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو دلائل سے جواب بھی دینا چاہتا ہوں۔ ان مسائل پر میں نے ہمیشہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر غور کیا ہے اور اس سے ہمیشہ یہی توقع رکھی ہے کہ وہ مجھے ضرور صحیح راستے کی طرف ہدایت دے گا، مگر لغزش اور کمزوریوں کی وجہ سے ڈرتا ہوں کہ کوئی غلط صورت نہ اختیار کر بیٹھوں۔ اس لئے آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔

جواب:

آپ نے جن مسائل کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے ان کے بارے میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

(۱) ذبیحہ کی صحت کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ جانور کی شہ رگ کاٹ کر خون نکال دیا جائے

بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ "جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انگلستان میں جو جانور قتل کئے جاتے ہیں ان پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس لئے ان کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سورۂ مائدہ میں "طعام اہل کتاب" کو ہمارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو چیزیں خدا نے ہمارے لئے ناجائز ٹھیرائی ہیں انھیں بھی ہم اہل کتاب کے ہاتھ سے لے کر کھا سکتے ہیں۔ اس بنا پر میرے لئے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ آپ کو اپنی خوراک کے معاملے میں جو مشکل پیش آ رہی ہے اس کا حل ضروری ہے۔ سو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ غیر گوشتی یا نباتی غذا (VEGITERIANDIET) پر اکتفا کریں جس کا انتظام انگلستان میں ہو سکتا ہے، اور اگر گوشت کو کوئی ٹکڑا اس میں نکل آئے تو کھانے سے پہلے اس کو شکایت کر کے اس کا سدباب کر لیں۔ دوسرے یہ کہ وہم کو دل سے نکال دیں۔ جو چیز آپ کے سامنے دسترخوان پر پیش ہو اس میں اگر کوئی حرام شے موجود نہ ہو تو اسے اطمینان کے ساتھ کھا لیجئے اور اس اندیشے سے اپنے ذہن کو پریشان نہ کیجئے کہ اس میں کسی حرام کھانے کا چھینٹا ڈال دیا گیا ہوگا، یا اس میں کسی حرام جانور کی چربی شامل کر دی گئی ہوگی۔ آپ کو اپنے عمل کی بنیاد علم اور یقین پر رکھنی چاہیئے نہ کہ گمان اور اندیشے کی بنا پر۔ آپ صرف اس غذا سے پرہیز کریں جس میں کسی حرام چیز کے شمول کا آپ کو علم ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ جب کبھی گوشت کھانا چاہیے تو مچھلی پکوا لیں، یا یہودیوں کا ذبیحہ حاصل کریں جس کا ملنا انگلستان میں مشکل نہیں ہے۔

(۲) نمازوں کے بارے میں جس مشکل کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا حل یہ ہے کہ ظہر کی نمازیں اگر سنتیں ادا کرنے کا وقت نہ مل سکے تو صرف فرض پڑھ لیا کریں، اور عصر کے لئے وقت ملنے کی اگر کوئی صورت ممکن نہ ہو تو مغرب کے ساتھ قضا پڑھ لیا کریں۔ دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے معاملے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ظہر اور مغرب کے آخر وقتوں میں عصر کو ظہر کے ساتھ اور عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک وقت کی نماز کے ساتھ دوسرے وقت کی نماز پیشگی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس بات پر قریب قریب تمام علمائے اہل سنت نے ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی شخص دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی عادت بنا لے۔ کیونکہ اس طرح تو عملاً پانچ وقت کی

تین وقت ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ لہذا آپ اس سے تو پرہیز کریں۔ البتہ جب کبھی عصر کی نماز پڑھنا ممکن نہ ہو، اسے قضا پڑھ لیا کریں۔

مجھے افسوس ہے کہ ہماری حکومت جن لوگوں کو تعلیم و تربیت کے لئے باہر بھیجتی ہے ان کی مذہبی ضروریات کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتی۔ اگر سرکاری طور پر اس کی فکر کی جاتی تو انگلستان میں ہمارے طلبا کے لئے حلال غذا کا بھی انتظام ہو سکتا تھا اور نمازوں کے لئے بھی ان کو وقت دلوایا جا سکتا تھا۔

(ا-م)

اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان

سوال:

آپ کا مضمون بعنوان "ادب اور اخلاقی اقدار" جو ماہنامہ یثرب (شمارہ ستمبر و اکتوبر) میں شائع ہوا میری نظر سے گزرا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اخلاقی اقدار کو لٹریچر میں پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو قرآنِ حکیم نے اختیار کیا۔ قرآنِ حکیم حُسنِ کلام اور تاثیرِ کلام کا سب سے مکمل نمونہ ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ قرآنِ حکیم نے انسانیت کو سنوارنے کے لئے لٹریچر میں اخلاقی اقدار کو جس طرح پیش کیا ہے، اس طرزِ بیان کو اختیار کریں۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان کونسا ہے؟

جواب:

قرآنِ حکیم اخلاقی اقدار کو فلسفۂ اخلاق کی زبان میں پیش نہیں کرتا، بلکہ حکایات، تمثیل، تشبیہ و استعارہ، تعریض، زجر و توبیخ اور وعدہ وعید کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اس طرزِ بیان سے انسان کا نفس بھی متاثر ہوتا ہے اور ذہنیت بھی بنتی ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں وہ ایک تاریخی قصے کے پیرائے میں بہت سے لیکچر ایسے طریقے سے کرتا ہے کہ خود بخود انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کا اخلاقی نقطۂ نظر انسانیت کا

بلند نمونہ ہے، اور اس کے مقابلے میں برادرانِ یوسفؑ، امرأۃ العزیز، زنانِ مصر اور حکامِ مصر تصویرِ انسانیت کے برے نمونے ہیں۔ یہ چیز آپ سے آپ چند اخلاقی قدروں کو انسان کے ذہن میں جاگزیں کر دیتی ہے اور ان کا اثر فلسفیانہ زبان کی بہ نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

یہ تاریخی قصہ جس ماحول میں بیان کیا گیا تھا، اس پر یہ پوری طرح منطبق بھی ہو رہا تھا اور اس کے نزول کے وقت میں اس طرح کے سارے کردار عملاً موجود تھے جن کی اس قصے میں کوئی حصہ داری تھی۔ سورۂ یوسف کے آئینے میں دراصل قرآن نے اہلِ مکہ کو ان کی صورتیں دکھانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔

پھر قرآن میں انسان کے اخلاقی کرداروں کو تمثیلی پیرایہ دے کر جا بجا اس طرح سامنے لایا گیا ہے کہ بعض اخلاقی قدروں کی اہمیت اور بعض کا قابلِ نفرت ہونا پوری طرح محسوس ہو جاتا ہے۔ کسی خاص طرز کی انسانی سیرت کو مرئی شکل میں سامنے لانے کے لئے جو مثالیں قرآن میں مذکور ہیں ان میں سے ایک سورۂ اعراف میں ہے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ ایسے لوگ جو آیاتِ الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی ہوائے نفس کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں ان کے کیرکٹر کی تصویر کیا ہے۔ فرمایا: فمثلہ کمثل الکلب ج ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث ط یعنی ہوا پرست آدمی اپنی اخلاقی ذہنیت کے اعتبار سے ایک کتے کی طرح ہوتا کہ جس کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے اور نہ جس میں غیرت و حمیت ہی ہوتی ہے، اسے دھتکارئیے تو بھی زبان لٹکا دے گا اور اس سے نگاہ پھیر لیجئے تو بھی زبان لٹکائے رکھے گا۔ پھر اس تمثیل میں جس کردار کو بیان کیا گیا ہے اس کی زبان کو اتنا نمایاں کر دیا گیا ہے کہ اس سے خود بخود ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ کردار پیٹ کا بندہ ہے۔

ایک دوسری تمثیل سورۂ المدثر میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو: فما لھم عن التذکرۃ معرضین ؟ کانھم حمرٌ مستنفرۃ ہ فرّت من قسورۃ۔ اس مختصر تمثیل سے ان مشرکینِ عرب کا کردار دکھانا مطلوب ہے جو دعوتِ حق سے خود بھی اعراض کئے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے دور بھگاتے تھے۔ اب قرآن نے استعارے کے طور پر ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ جیسے کچھ گدھے جنگل میں چر رہے تھے کہ کچھ آواز (خاص طور شیر کی دہاڑ) ان کے کانوں میں پڑی، اور وہ بغیر سوچے سمجھے کہ آواز کیا ہے، کدھر سے آ رہی ہے، بدک کر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے، اور اس انداز سے بھاگے کہ بس جو ملا اسے بھی خوف و اضطرار کی حالت میں مبتلا کر کے ساتھ لے

یہ تمثیل دراصل گدھے کی جن صفات کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے ان میں سے ایک صفت حمق کی ہے، یعنی گدھا جانوروں میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ حواس سے پوری طرح کام نہیں لیتا۔ دوسری صفت ڈرنے اور بدکنے کی ہے کہ ذرا کھٹکا ہوا اور اس نے کان کھڑے کر لئے۔ تیسری صفت بھاگ کھڑے ہونے کی ہے کہ خطرے کا سامنا کرنے یا پیش آمدہ صورت سے نمٹنے کے بجائے اس کا طریق کار ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ شور مچاتا ہوا اس طرح بھاگے گا کہ اس کا انداز دوسرے ساتھیوں کو بھی بھاگنے کی دعوت دینے والا ہو۔

تمثیل میں یہ اشارہ لطیف چھپا ہوا ہے کہ جس طرح شیر کی آمد پر گدھے کا اندھا دھند بھاگ کھڑے ہونا ذریعۂ نجات نہیں ہے، بلکہ اگر شیر تعاقب کر رہا ہے تو وہ بہرحال آ ہی لے گا، اسی طرح مشرکین جس دعوت پر غور کئے بغیر اس سے بھاگے پھر رہے ہیں وہ ایک دن ان کو آلے گی۔

قرآن کے انداز بیان میں ایک پہلو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نفس انسانی کا تجزیہ کر کے اس کے چور پکڑتا ہے۔ پھر وہ مختلف اخلاقی قدروں کو کرداروں کے پیرائے میں لا کر ان کا تقابل کرتا جاتا ہے۔ پھر وہ ماضی کے واقعات کو حال پر چسپاں کرتا ہے۔ پھر وہ مستقبل (خصوصاً عالم آخرت) کو حال بلکہ ماضی بنا کر دکھاتا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن پیش آنے والے احوال کو زیادہ آسانی سے قبل از وقت سمجھ سکے۔

اس طرح اگر قرآن کے طرز بیان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ طرز بیان نہ تو فلسفیانہ ہے نہ زاہدانہ واعظانہ بلکہ اعلیٰ درجے کا ادبی طرز بیان ہے۔ (ن۔ص)

قرآن میں چوری کی سزا

سوال:

اس خط کے ہمراہ ایک مضمون "قرآن میں چور کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ اسے اپنے ماہنامہ میں شائع فرما دیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مختلف لوگ اس پر اظہار خیال کریں۔ اگر آپ الحمد میرے ساتھ متفق ہوں تو پھر زنا کے جرم کے بارے میں بھی اسی طرح کی تشریح کی جائے۔

مجلسِ دستور ساز پاکستان کے سامنے زنا اور چوری، دو فوجداری جرم ایسے ہیں جن کی شرعی سزا موجودہ رجحانات کے خلاف ہے۔ میرے مضمون کا منشا یہ ہے کہ مجلس مذکورہ کے لئے یہ ممکن ہو جائے کہ وہ اپنے قانون کو ایک طرف قرآن کی سزاؤں کے مطابق بنا سکے اور دوسری طرف لوگوں کے خیالات کا لحاظ بھی رکھ سکے۔ جہاں تک ہو سکے کسی جرم میں قید کی سزا نہ دی جائے اور بید، جرمانہ، جلاوطنی وغیرہ سزاؤں کو رواج دیا جائے تو یہ عین قرآن کے منشا کے مطابق ہوگا۔

نوٹ:۔ جناب سائل کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباس اخبار پیغام صلح مورخہ یکم نومبر ۵۰ء کے تراشے سے لئے گئے ہیں جو خط کے ساتھ موصول ہوا ہے۔ (ن۔ ص)

"اس آیت (سورۂ مائدہ ـــ ۳۸، ۳۹) میں چوری کے جرم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ السارق کے ساتھ السارقہ کے لفظ سے تمام مفسرین نے یہی سمجھا ہے کہ اس سے مراد چور عورت ہے" ـــــــ "مگر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی نوع انسان کے لئے کسی انعام یا سزا کا ذکر کرتا ہے تو شاذو نادر حالتوں کے بغیر صرف مذکر کے لئے کرتا ہے اور مؤنث خود بخود اس میں شامل سمجھی جاتی ہے" ـــــــ "حقیقت یہ ہے کہ یہاں سارقہ سے مراد چور کا معین و مددگار ہے۔ دنیا میں دو قسم کے آدمی ہیں: ایک وہ جو کام کر رہے ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے مددگار ہیں۔ مرد اور عورت میں سے بالعموم مرد کام کرنے والا ہوتا ہے اور عورت اس کی مددگار ہوتی ہے۔ اس لیے مددگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید نے بالعموم جہاں کہیں کسی کام یا نتیجہ میں مرد کے ساتھ عورت کا صیغہ استعمال کیا ہے وہاں ہمیشہ اس سے مراد اس کام میں معین و مددگار رہی ہے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ فعلِ زنا میں مرد کا پہلا مددگار زانیہ ہوتی ہے اور دوسرا مددگار وہ دلال ہوتے ہیں جو بیچ میں پیغام رسانی کر کے اسے وقوع میں لاتے ہیں اور تکمیل کراتے ہیں۔ اسی لئے زانیہ کے لفظ میں وہ سب شامل ہیں۔ اسی طرح چوری کا کام بالعموم انجام نہیں پا سکتا، جب تک تاڑ بازی کرنے والے، چور کے پناہ دہندہ اور چوری کے مال کے چھپانے والے نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سارقہ کے لفظ میں ان سب کو شامل کیا ہے، اور سب کے لئے

ایک ہی سزا یعنی ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے" ——— "یہ بات کہ یہاں سارقہ سے چور کے مددگار مراد ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے کہ سارق اور سارقہ کے درمیان واؤ کا لفظ لایا گیا ہے۔ حالانکہ اگر مراد چور عورت ہوتی تو واؤ کے بجائے اَوْ کا لفظ ہوتا" ——— "دوسری بات جو یہاں قابلِ غور ہے، یہ ہے کہ اللہ نے چور کو سچی توبہ کرنے کی مہلت دے کر سزا سے معاف فرمایا ہے، حالانکہ اسلامی فقیہوں کی تعزیرات میں معافی کا کوئی ذکر نہیں" (اس موقع پر توبہ کے بارے میں چند احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ن۔ ص) "پس میری رائے یہ قرآن کی رو سے چور کو سچی توبہ کرنے کا ایک دفعہ موقع ملنا چاہیئے۔ اگر باوجود توبہ کے وہ پھر چوری کرے تو اس کو ضرور سزا ملنی چاہیئے" ——— "قرآن جب ایک طرف چور کی معافی کا ذکر کرتا ہے اور دوسری طرف ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چوری کے لئے کم سے کم سزا یعنی معافی سے لے کر زیادہ سے زیادہ سزا یعنی ہاتھ کاٹنا بتاتا ہے۔ اس واسطے یہ کہنا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنے کے سوا کچھ نہیں، میرے نزدیک اصولِ قرآن کی غلط تعبیر کرنا ہے" ——— "قرآن کی رو سے قاضی کو چور اور اس کے مددگاروں کے بارے میں پورا اختیار حاصل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ وہ ان سے توبہ کرا کے بالکل کورا بھی چھوڑ سکتا ہے اور بید، جرمانہ، قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔ انتہائی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اس تشریح کے ساتھ اس چیخ و پکار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قرآن کی سزائیں وحشیانہ سزائیں ہیں جو موجودہ متمدن دنیا میں قابلِ قبول نہیں۔"

جواب:

آپ نے چور کی سزا کے بارے میں جو استدلال فرمایا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سارقہ اور زانیہ سے مراد سرقہ اور زنا میں مدد کرنے والے لینا محض ایک تکلف ہے جس کے لئے عربی میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اس طرح قرآنی الفاظ میں زبردستی ایک معنی پیدا کرنے کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ رہی یہ بات کہ سارق کے ساتھ سارقہ کی تصریح کرنے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے معاملے میں سزا کی سختی کا تصور لوگوں کو ویسے ہی اچھا خاصا پریشان کرتا ہے، لیکن مرد کی بہ نسبت عورت کے حق میں یہ خیال اور بھی زیادہ پریشان کن ہو سکتا ہے۔ اس لئے صراحت کی گئی کہ مرد ہی نہیں عورت بھی چور ہو تو اس کو ضرور یہ سزا

دی جائے۔ یہی مصلحت زانی کے ساتھ زانیہ کی تصریح میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

واو عطف سے جو معنی آپ نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ عربی زبان میں واوِ عطف محض معیت ہی کے معنی میں نہیں آتا کہ آپ لازماً اس کے معنی یہ کریں کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں پر ایک ساتھ حکم جاری ہو۔ "واو" مطلق جمع کے لئے بھی آتا ہے اور اس سے مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ جو حکم بیان کیا جا رہا ہے اس میں معطوف اور معطوف علیہ دونوں یکساں ہیں۔ اس صورت میں اس کا فائدہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو "او" کا ہے، یعنی خواہ معطوف یا معطوف علیہ دونوں میں سے جو بھی ہو اس کا وہی حکم ہوگا جو بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے تو آیت فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کا مطلب آپ یہ لیتے ہیں کہ دو دو یا تین تین، یا چار چار، نہ کہ یہ سب ایک ساتھ لہٰذا السارق والسارقۃ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں پر یہی قطع ید کا حکم جاری ہوگا۔

چور کی توبہ کے معاملے میں آپ نے جو بحث فرمائی ہے اس میں آپ یہ بھول گئے ہیں کہ آخر کونسا چور ہوگا جسے اگر سزا سے بچنے کی امید ہو تو وہ توبہ نہ کرلے گا؟ اور آپ کس جگہ یہ حد مقرر کریں گے کہ اتنی بار توبہ کر لینے پر بھی جو شخص چوری سے باز نہ آئے تو پھر اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟

آپ کا یہ سوال بھی صحیح نہیں ہے کہ چوری اور زنا میں مدد کرنے والوں کے لئے قرآن میں کیا سزا مقرر کی گئی ہے؟ ایک یہی معاملہ کیا، قرآن میں تو قانونِ تعزیرات کی بہت سی دفعات کے بارے میں سکوت کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم یا تو ہر جرم کی سزا قرآن ہی سے نکالیں، یا پھر قرآن کے ذکر کردہ جرائم اور سزاؤں کے سوا کسی جرم پر سزا نہ دیں؟ قرآن تو صرف حدود مقرر کرتا ہے۔ باقی رہا تعزیرات کا معاملہ، تو شریعت میں یہ مسلّم ہے کہ اس باب میں حسبِ ضرورت احکام مدوّن کئے جا سکتے ہیں۔ (ا۔م)